© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

ایک آیت

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (الزمر: ۲۳)

اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا، جو ایک ایسی کتاب کی صورت میں ہے، جس کے مضامین باہم ملتے جلتے ہیں اور دہرائے جاتے ہیں، جس سے ان لوگوں کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف جھک جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس سے وہ، جسے چاہتا ہے نوازتا ہے، اور جس کو اللہ گمراہ کر دے، اسے راہِ راست پر لانے والا کوئی نہیں۔

قرآن مجید اور اس سے تعلق و وابستگی کے اعتبار سے یہ آیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ایک تو اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کس عظمت و شان کا مالک ہے۔ دوسرے ان کیفیات کی وضاحت کی گئی ہے، جن کا اس کی تلاوت کے وقت قاری پر طاری اور نمایاں ہونا اللہ کو مطلوب و مقصود ہے۔ تیسرے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کی ہدایت و ضلالت کے متعلق ایک قانون مقرر کر دیا ہے، جس کے مطابق کتنے ہی لوگ قرآن سے قلبی اور روحانی فیض حاصل کرتے ہیں، اور کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کو محرومی اور شقاوت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ قساوتِ قلبی کا شکار ہیں اور جن کے دل سخت ہو گئے ہیں، ان کے سینوں پر یوں سمجھیے کہ گویا تالے پڑ چکے ہیں۔ وہ قبولِ حق اور اسلام کے لیے نہیں کھل سکتے ــــ اس آیت میں قساوتِ قلبی کا صحیح علاج تجویز کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن ہی اس مرض کی اصل دوا اور اسی میں شفا کا راز مضمر ہے۔ اس سے دلوں کی سختی اور قلوب کی قساوت دور ہوتی ہے، اور اس کی تلاوت کو معمول بنا لینے سے وہ نرم پڑ جاتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ انسان طلبِ ہدایت اور قبولِ حق کے لیے آگے بڑھے اور اللہ کے حضور عجز و انکسار کے ساتھ دامن پھیلا دے۔

اس آیت میں قرآنِ مجید کو "احسن الحدیث" کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیر اور خوبیاں اس قدر جمع ہیں کہ دنیا کی کوئی کتاب اور کوئی تصنیف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے افضل و اشرف ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے اور منزّل من اللہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیثِ قدسی کے یہ الفاظ یاد رکھنے کے لائق ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الرب تبارک وتعالیٰ من شغلہ القرآن عن ذکری ومسألتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین وفضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضلِ اللہ علی خلقہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص قرآن (کی تلاوت و مطالعہ) میں اس قدر مصروف رہا کہ اسے دیگر اذکار و دعا کا موقع نہیں مل سکا۔ میں اسے دعا مانگنے والوں سے بھی زیادہ عطا کروں گا۔ اور تمام کلاموں پر اللہ کے کلام کو ایسی فضیلت حاصل ہے، جیسی کہ اللہ کو اس کی مخلوق پر حاصل ہے۔

قرآن مجید کے بہترین کلام (احسن الحدیث) ہونے کے بہت سے وجوہ و اسباب ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ قرآن مجید ایک ایسی سچی کتاب ہے، جس کی صداقت پر اس کا ایک ایک لفظ شاہد ہے، اور اس کے مضامین ہر اعتبار سے اس کی حقانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کا پیش کردہ لائحہ عمل، اس کے نظریات و تصورات، اس کی تعلیمات اور اس کے احکام و قوانین ہر قسم کے اشتباہ، ہر نوع کی غلطی اور شک سے قطعی طور سے پاک ہیں۔ اس کی رہنمائی بدرجہ غایت اعتماد کی مستحق اور انسانی فوز و فلاح کی ضامن ہے۔

۲۔ قرآنِ مجید ان تمام قوموں کو کامرانی و بہبود کی ضمانت دیتا ہے اور ان کے مسائل و مشکلات کے حل و کشود کی صورتیں پیش کرتا ہے، جو اس کے مقاصد و نظریات کو قبول کرتی اور اس پر عمل کی دیواریں استوار کرتی ہیں۔

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ اٰخرین (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کتنی ہی قوموں کو رفعت بخشتا اور کتنی ہی قوموں کو پست کرتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اللہ کی یہ کتاب اس لائق ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور اس عالمِ رنگ و بو کا ہر انسانی گروہ اس کے احکام کا خیر مقدم کرے۔ اس کی باتوں کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اتارے اور اس کی قیادت و رہنمائی کو عملی طور سے تسلیم کرے اور تعمیل ارشاد کی غرض سے اس کے بابِ عالی پر دستک دے۔

۳۔ تربیتِ نفس اور تزکیۂ قلب کے لحاظ سے بھی قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ فطرتِ انسانی سے عین ہم آہنگ ہے۔ یہ انسان کے قلب و ذہن کو سنوارتا، اس کے طبعی رجحانات و میلانات کا صحیح رخ متعین کرتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جذبات و خواہشات کو پاکیزگی کی راہ بتاتا اور سیرت و کردار کی تطہیر کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان فکری و عملی ارتقاء کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس باب میں دنیا کی اور کوئی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

۴۔ پیرایۂ اظہار اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی یہ صحیفۂ آسمانی بہترین کتاب اور احسن الحدیث ہے۔ اس کا انداز اس درجہ مؤثر اور رقت انگیز ہے کہ ہر بات دل میں اترتی جاتی ہے۔ اس کی تلاوت سے عزم میں پختگی ابھرتی اور یقین میں استحکام پیدا ہوتا ہے، اس کی حلاوت اور سلاست و روانی کا یہ عالم ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی قلب و روح کی تشنگی دور نہیں ہوتی۔ اگر قاری کو الفاظ کے ساتھ معانی سے بھی شناسائی ہو تو نظر و بصر کے دریچے کھل جاتے ہیں اور دل کی تمام قوتیں اور فکر و فہم کی سب طاقتیں اسی پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں، دوسری طرف، عنانِ توجہ مبذول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبوں میں اسی لیے تو فرمایا کرتے تھے:

اِن خیر الحدیث کتاب اللہ

(بہترین کلام، اللہ کی کتاب ہے ــــ اس کی تلاوت کثرت سے کرنی چاہیے)۔

اس آیت میں ایک لفظ "متشابہا" ہے۔ اس کا مصدر "شبہٌ" اور "شَبہٌ" ہے۔ جس کے معنی مماثلت کے ہیں۔ لفظ مشابہت بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ "شبہ" کی اصل بھی یہی ہے۔ جن دو چیزوں کے درمیان مشابہت پیدا ہو جانے کے باعث، تمیز کرنا مشکل ہو جاتے، اسے "شبہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "متشابہ" کا لفظ متماثل کے ہم معنی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔ قرآنِ مجید میں اس لفظ کا استعمال کئی مواقع پر ہوا ہے:

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرہ ، ۲۵)

اور جنت میں ان کو ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے۔

یعنی بظاہر وہ اس دنیا کے پھلوں جیسے ہوں گے، لیکن ذائقے میں ان سے مختلف ہوں گے۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (البقرہ ، ۱۱۸)

ان کے دل ایک دوسرے کے جیسے ہو گئے۔

یعنی گمراہی اور جہالت میں وہ لوگ ایک جیسے ہو گئے۔

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران ، ۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دوسری آیات متشابہ ہیں۔

یعنی ایسی آیات جن کی حقیقت کا انسان پوری طرح ادراک نہیں کرسکتا۔ لہٰذا انھیں انسانی فہم کی مناسبت سے متماثل شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً عرش اور لوحِ محفوظ وغیرہ۔

مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ط (الانعام: ۱۴۱)

ایسے پھل جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ایسے بھی جو باہم مشابہت نہیں رکھتے۔

قرآنِ مجید میں متشابہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ان میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ قرآنی تعلیمات و ہدایات کا دائرہ اس درجہ وسیع ہے کہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ عقائد و عبادات کے بارے میں بھی واضح ہدایات دیتا ہے، سیاست و معیشت کے بنیادی اصولوں سے بھی بحث کرتا ہے۔ اخلاق و کردار کے ضابطے بھی متعین کرتا ہے، تہذیب و ثقافت کی صحت مندانہ راہوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے، نظامِ حکومت و تشکیلِ ریاست کے مبادیات کا بھی ایک نقشہ پیش کرتا ہے اور مخالفین و موافقین سے تعلقات و روابط کی بھی نہایت معتدل و متوازن صورتیں اسلامی معاشرے کو بتاتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں اس ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کے باوجود، کمال یہ ہے کہ پوری طرح اعتدال و اقتصاد اور توازن و ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ انسان اگر اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھے تو ایک ایسے مزاج کی تخلیق ہوتی اور ایسی بصیرت پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے جملہ مسائل کو حل کرنے میں بے حد مدد دیتی ہے اور سفرِ حیات کی سمتوں کو واضح طور سے متعین کرتی ہے۔

مضامینِ قرآن کی باہم مشابہت اور ایک دوسرے سے ہم آہنگی کو اس انداز سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس نے محاسنِ اخلاق پر اس درجہ زور دیا ہے کہ دشمن سے بھی گفتگو اور اسلوبِ کلام میں یا جنگ و جدال میں غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر دشمنانِ اسلام سے جنگ و جہاد کی ترغیب دی ہے تو دوسری طرف ان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرنے کی بھی تاکید کی ہے۔ اسی طرح معاشرت، لین دین، اقتصادیات و معاشیات اور جنگ و صلح کے بارے میں بھی اس کی ہدایات اور تعلیمات میں انتہائی توافق پایا جاتا ہے اور اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی وضاحت کرتا ہے۔

اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔

اس آیت میں ایک لفظ "مثانی" آیا ہے۔ یہ مثنی کی جمع ہے اور اس کا مادہ "ثنی" ہے، جس کے معنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، دہرانا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ سورۂ فاتحہ کو "مثانی" کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ (الحجر: ۸۷)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے آپ کو وہ سات آیتیں دیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں (یعنی سورۂ فاتحہ) اور قرآن عظیم عطا کیا۔

لیکن اس آیت میں مثانی کو قرآن کی صفت بیان کیا گیا ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے ایک شعر میں بھی مثانی سے قرآن مجید مراد ہے:

من للقوافی بعد حسان و ابنہ ۔۔۔ و من للمثانی بعد زید بن ثابت

یعنی حسان اور ان کے بیٹے کے بعد قافیہ بندی کا ماہر کون ہوگا؟ اور زید بن ثابت کے بعد مثانی (قرآن) کا عالم کہاں ملے گا؟

اگر مثانی کو قرآن کی صفت مراد لیا جائے تو اس کے معنی مندرجہ ذیل ہوں گے۔

ایک یہ کہ قرآن میں عقائد، جزا و سزا، اعمال کی جواب دہی اور مسئولیت، انسانی اصلاح، ایک خاص ضابطہ حیات، بنیادی تعلیمات، سبق آموز و عبرت خیز واقعات اور انبیا علیہم السلام کے حالات و قصص، مختلف اسالیب میں بار بار دہرائے اور بیان کیے گئے ہیں، تاکہ یہ تمام باتیں اچھی طرح انسان کے ذہن میں بیٹھ جائیں اور پھر انھی کی روشنی میں اس کی فکری و عملی تربیت ہو۔ یہ باتیں اس لیے بھی بار بار بیان کی گئی ہیں کہ قرآن کا انداز دعوتی ہے، اور دعوت کے لیے ضروری ہے کہ ایک بات مختلف پیرایۂ بیان میں ادا کی جائے۔

دوسرے یہ کہ قرآن کی آیات اس لائق ہیں کہ انھیں بار بار دہرایا اور پڑھا جائے اور کثرت سے ان کی تلاوت کی جائے، اس لیے کہ جتنی دفعہ بھی انھیں پڑھا جائے گا، انسان کی فیض یابی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ یہ ایسا بابرکت کلام ہے کہ بار بار پڑھنے کے باوجود اس سے طبیعت میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ پہلے سے زیادہ دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس سے شغف بڑھتا ہے اور تلاوت کے لیے ہر لحظہ مزید رغبت اور شوق پیدا ہوتا ہے۔

ترمذی کی ایک حدیث میں اس کیفیتِ قلبی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لا یشبع منہ العلماء لا یخلق عن کثرۃ الرد و لا تنقضی عجائبہ۔

علما اس کی تلاوت سے سیر نہیں ہوتے، اس کی تعلیمات بار بار پڑھنے سے پرانی نہیں ہوتیں اور اس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں۔

بعض حضرات لفظ مثنی کے معنی "ثنا" کرتے ہیں۔ اگر اس کے معنی ثنا کے ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید اللہ کی حمد و ثنا پر مشتمل ہے اور خود بھی سراپا ثنا ہے۔ اس کے الفاظ و معانی اللہ کی ثنا اور تعریف ہی کو محیط ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیت زیرِ تفسیر میں ایک لفظ "تَقْشَعِرُّ مِنْهُ" ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ "اس (قرآن) سے خدا سے ڈرنے والوں کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس سے قرآنِ مجید کی صفتِ تاثیر کی وضاحت ہوتی ہے اور ان کیفیات کا پتا چلتا ہے جو اس کی تلاوت کے موقع پر مطلوب ہیں۔!

تلاوتِ قرآن کے وقت یہ کیفیت اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے، جس کا قلب صاف ہے، ذہن میں بالیدگی ہے اور قبولِ حق کے لیے اپنے اندر ایک خاص جذبہ رکھتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ان پر عمل کے لیے ساعی ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ قرآن کو گا گا کر تکلف سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ ایسا نہج تلاوت اختیار کرنا چاہیے جس سے جسم اور روح متاثر ہوں اور دل میں خشوع و خضوع کی ایک خاص کیفیت کروٹ لینے لگے۔ قلب میں نرمی اور گداز پیدا ہو اور شدتِ تاثر سے آنکھیں پُرنم ہو جائیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن مسعود قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اقرأ علیّ القرآن، فقلت یا رسول اللہ اقرأ علیك و علیك نزل۔ قال انی احب ان اسمعه من غیری۔ فقرأت علیه سورة النساء، حتی جئت الی هذه الآیة "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا" قال حسبك الآن، فالتفت الیه فاذا عیناه تذرفان۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ میں نے عرض کیا، اے رسولِ خدا، میں آپ کو قرآن سناؤں، حالانکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے۔ فرمایا۔ میں دوسرے سے سننا پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ میں نے سورۂ نساء پڑھنا شروع کی۔ جب میں اس آیت "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا (الآیہ) (یعنی اس دن کیا حالت ہوگی، جب ہم ہر امت میں سے گواہ لے آئیں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ ٹھہرائیں گے)" پر پہنچا تو آپؐ نے فرمایا۔ اب بس کرو۔ میں نے آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کس انداز سے قرآن پڑھتے اور سنتے تھے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وہ ۔۔۔ تکلف سے اپنے اندر کسی مصنوعی کیفیت کا مظاہرہ کرتے تھے، بلکہ اطمینان، ثبات،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکون، ادب اور خشیتِ الٰہی میں اس قدر ڈوب جاتے کہ ان صفات میں کوئی ان کا ہم پایہ نہیں ہے۔[1]

اس آیت میں تلاوتِ قرآن کے وقت مومنوں کی ایک صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:

ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ط

پھر ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے نرم پڑ جاتے ہیں۔

یعنی قرآن سے متاثر ہو کر پہلے رونگٹے کھڑے ہو جانے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر دلوں میں نرمی اور گداز کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں حالتیں باہم مل کر طبیعت میں اعتدال و توازن پیدا کرتی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ جس طرح ایک مومن کا معاملہ خوف اور رجا کے درمیان ہوتا ہے۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے خوف زدہ بھی رہتا ہے اور اس کی مہربانی اور کرم کی امید و رجا بھی دل میں رکھتا ہے، ٹھیک اسی طرح تلاوتِ قرآن کے وقت ایک مومن پر یہ دونوں کیفیتیں طاری ہو جاتی ہیں۔ ایک کیفیت خشیتِ الٰہی سے کانپ اُٹھنے کی اور دوسری کیفیت ذکرِ الٰہی سے سکون و اطمینان حاصل کرنے کی۔

گویا جسم و قلب کے گداز ہو جانے کا مطلب، سکون و طمانیت کا حصول ہے، جسے رحمتِ الٰہی کے نزول کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن اور حدیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تلاوت کے وقت اللہ کی طرف سے سکون اور رحمت کا نزول ہوتا ہے۔

آیت کے آخری الفاظ میں قاری کی اثر پذیری کی اس کیفیت کو اللہ کی ہدایت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی جس کا مستحق اللہ کے قانونِ ہدایت کی رُو سے وہ شخص ہے جو قرآن پڑھتا اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوا کہ جو لوگ اللہ کے مقرر کردہ قانونِ ضلالت کے مطابق گم کردہ راہ ہیں، انھیں قرآن سے فیض حاصل کرنے اور اس کے احکام سے ہدایت یاب ہونے کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔ وہ لوگ انتہائی بدنصیب ہیں۔ وہ سماعِ قرآن کی لطف اندوزی سے محروم اور اپنی زندگی کے لیل و نہار کو اس کے احکام کے قالب میں ڈھالنے کی نعمت سے تہی دامن ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر۔ ج ۴، ص ۵۱

© rasailojaraid.com